کشمکش

مائل خیرآبادی

بھٹّوں کی چوری

ہمارے ابّا جان کا بھی عجیب طریقہ ہے۔ بھلے لوگوں کی عزت اور خاطر داری تو سب کرتے ہی ہیں۔ ابّا جان محلے کے بُرے لوگوں کی بھی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ہر جمعہ کو کسی نہ کسی آدمی کو ناشتہ پر بلاتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو پہچانتی ہوں۔ پچھلے ہی جمعہ کو لیجئے۔ غفورا کو ناشتہ پر بلایا۔ اس سے پہلے والے جمعہ کو جلال کو ناشتہ کرایا۔ میں ان لوگوں کا آنا پسند نہ کرتی۔ امّی بھی برا مانتیں۔ امی کہتیں۔ ان لوگوں کو منہ نہ لگانا چاہئے۔ یہ لوگ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ اور بھئی سچی بات یہ ہے کہ ایک جمعہ کو، ارے بھئی، اسی پچھلے جمعہ کو امّی جان کی بات سچ ہی نکلی۔ ابّا جان نے غفورا کو ناشتہ پر بلایا۔ غفورا ناشتہ کرتا جاتا اور ہمارے پڑوس میں ہماری جگہ میں جو مکّا بوئی تھی، تو وہ مکّا کے بھٹّوں کو دیکھتا جاتا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا ابّا جان سے کہنے لگا۔ ''میاں! آپ کے بھٹّے تو بڑے زوردار ہیں۔'' ابّا جان نے کہا۔ ''آج ارادہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد بھٹّے توڑوں گا۔ خدا نے توفیق دی تو محلے بھر میں یہ تحفہ بانٹوں گا۔''

میں نے اس کی یہ بات سن لی، میں نے جا کر امّی جان سے کہی۔ وہ بولیں ''اوئی اللہ! اس نے ماشاءاللہ'' نہیں کہا۔'' میں نے کہا ''اس نے'' ماشاءاللہ'' تو نہیں کہا، ماشاءاللہ کہنے سے کیا ہوتا ہے امّی جان؟'' امّی جان نے بتایا کہ ماشاء اللہ کہنے سے نظر نہیں لگتی اور تعریف کرنے والے کی بہت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اب دیکھئے۔ ابّا جان ایک بجے جمعہ کی نماز پڑھنے چل دیئے۔ رشاد بھائی بھی ساتھ گئے۔ ہم عورتیں اور بچیاں نہانے دھونے لگیں۔ اس میں ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ابھی ہم فارغ نہیں ہوئے تھے کہ بی پڑوسن نے شور مچایا۔ ''اے بی ملاّنی! وہ دیکھو، غفورا کے دونوں لڑکے تمہارے بھٹّے توڑے لئے جا رہے ہیں۔''

بی پڑوسن نے بھٹّے توڑنے کی آواز اپنے گھر سے سنی تھی۔ وہ شور کرنے لگیں۔ امّی جان ہم بچیوں کو چھوڑ کر دوڑیں، پچھواڑے گئیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ پیچھے کی طرف سے سارے بھٹّے غفورا کے لڑکے توڑ لے گئے تھے۔ امّی جان کوسنے لگیں۔ ہاتھ ٹوٹیں، خدا کرے ہضم نہ ہوں۔

امی جان یہ کہہ ہی رہی تھیں۔ اتنے میں ابا جان آ گئے۔ ''کیا بات ہے بھئی!'' ابا جان نے پوچھا۔ ان کو سارا حال بتایا گیا اور رائے دی گئی کہ

رپورٹ کردو۔ ابھی مال برآمد ہو جائے گا۔ یہ چور جانیں تو کہ بھٹے چرانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

اس رائے کے جواب میں ابا جان نے کہا۔ ''میں اس سے بڑی سزا دوں گا۔'' پوچھا گیا۔ ''آپ کیا سزا دیں گے؟'' بولے ''دیکھتے رہو تم سب۔'' یہ کہہ کر مکّا کے پودوں سے تیار بھٹّے توڑنا شروع کر دیئے۔ پھر سات سات بھٹّوں کے حساب سے محلے والوں کا حصہ لگایا۔ ان میں غفورا کا بھی حصہ تھا۔ رشاد میاں کو ساتھ لے کر چلے۔ مجھ سے کہا ''تو بھی چل!'' میں بھی ساتھ گئی۔ چلتے وقت امی جان نے کہا کہ یہ غفورا کا حصہ کیوں لگایا۔ ابا جان نے جواب دیا۔ ''آخر وہ بھی تو ہمارا پڑوسی ہے۔'' ہرگز نہیں، اس کا حصہ گھر پر ہی رکھ جاؤ۔''

امی جان یہ کہتی ہی رہیں اور ابا جان بھٹّے لے کر یہ جا وہ جا۔ گلی میں پہنچ گئے۔ یہیں سے بھٹّے ہر گھر میں بھیجنا شروع کر دیئے۔ ''رشاد میاں! یہ لو ابراہیم بھائی کے گھر دے آؤ۔ منی! تم یہ لو، رشیدہ بوبو کو دے آؤ۔'' اس طرح نام بتا بتا کر ہم دونوں کے ذریعہ بھیجوانا شروع کر دیئے اور آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ غفورا کا گھر آ گیا۔ رشاد میاں سے کہا کہ ''لو یہ غفورا بھائی کے گھر دے آؤ۔'' رشاد میاں ابا جان کا منہ تکنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''ابا جان! غفورا کے

لڑکے تو بہت سے بھٹے توڑ لے گئے۔ آپ انھیں بھی بھٹے بھجوا رہے ہیں؟''

ابا جان نے ہم دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر خود آگے بڑھے۔ غفورا کے دروازے کی کنڈی بجائی۔ اندر سے عورتوں نے دیکھا۔ غفورا اندر ہی تھا سب گھبرا گئے۔ میں نے کواڑ کی درواز سے دیکھا۔ وہ سب بھٹے چھپانے لگے۔ ابا جان نے ہمیں منع کیا کہ جھانکو مت۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح جھانکنے کو منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد ابا جان نے پکارا۔ ''غفورا بھائی! السلام علیکم۔'' اندر سے آواز آئی گھر میں نہیں ہیں۔''

''اُف اللہ میری توبہ! کھلا جھوٹ بول گئے گھر والے۔'' لیکن ابا جان بالکل ہی بھولے بن گئے۔ پکارے ''اچھا تو کسی بچے کو بھیج دیجئے۔''

کئی منٹ کے بعد ایک چھوٹی سی بچی گھر سے نکلی۔ ابا جان نے اسے بھٹے دیئے اور کہلا بھیجا۔ ''آج بھٹے توڑے تھے۔ یہ آپ کے لئے تحفہ ہے۔'' یہ کہہ کر ابا جان ہم دونوں کو لئے آگے بڑھ گئے۔ بھٹے بانٹ کر گھر آئے تو امی جان نے ابا جان کی اچھی طرح خبر لی۔ ''دے آئے اُس چور اور بدمعاش کے گھر......'' امی جان نہ جانے کیا کیا کہتیں۔ ابا جان نے روک دیا۔ پھر بولے۔ ''اب ایک قصہ سنو، ایک بزرگ تھے۔ دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ دیکھا کہ ایک بچھو بہتا

چلا آرہا ہے۔ بچھو کوشش کرتا ہے کہ دھارے سے نکلے لیکن نہیں نکل پاتا۔ ان بزرگ کو ترس آ گیا۔ اسے پکڑ کر چاہا کہ زمین پر رکھ دیں کہ اس نے ڈنک مار دیا۔ ''اُف'' کی آواز آئی اور بچھو چھوٹ کر پھر ندی میں گر گیا۔ اُن بزرگ نے پھر اسے نکالا اور چاہا کہ خشکی پر رکھ دیں کہ بچھو نے پھر ڈنک مار دیا۔ بزرگ نے پھر اُف کی اور بچھو چھوٹ کر پھر ندی میں گر پڑا۔

اب قصہ یوں ہے کہ وہ بزرگ تو بار بار نکالتے۔ لیکن وہ ان کے ڈنک مار دیتا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اُس نے بچھو پر یہ مہربانی دیکھی تو کہنے لگا۔ ''آپ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہیں۔ وہ تو ڈنک مار رہا ہے اور آپ اس پر ترس کھا رہے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ بھئی! وہ اپنی عادت کے مطابق کر رہا ہے اور میں اپنی عادت کے مطابق کر رہا ہوں۔

یہ قصہ سنا کر ابا جان نے امی جان سے کہا۔ ''بولو اب کیا کہتی ہو، میں نیکی کے بدلے بُرائی کروں؟ قرآن میں تو یہ ہے کہ نیکیوں سے برائیوں کو مٹاؤ۔ میں نے یہی کیا۔ اب اللہ کو پسند آ جائے اور وہ قبول فرما لے۔ تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ ہمیں تو اس کے حکم کے مطابق کام کرنا ہے۔

ادھر ابا جان چپ ہوئے۔ اُدھر امی جان خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد

انگیٹھی جلائی۔ بھٹے بھونے جانے لگے اور ہم سب کھیل کود کر ''اہاہا بڑے مزے کا'' کہہ کہہ کر کھانے لگے۔

ہم سب کھا ہی رہے تھے کہ ہمارے دروازے کی کنڈی بجی۔ ''کون صاحب؟'' رشاد میاں نے پکارا اور کنڈی کھولنے چلے۔ دروازے تک گئے اور کنڈی کھولے بغیر واپس آ کر بولے۔ ''ابا جان! غفورا ہے۔''

یہ سن کر ابا جان اٹھے، انھوں نے جا کر کنڈی کھولی۔ رشاد میاں ساتھ تھے، میں بھی ساتھ چلی اور امی جان بھی ڈیوڑھی تک پہنچ گئیں۔ ابا جان نے جیسے ہی کنڈی کھولی۔ غفورا ڈیوڑھی میں آ کر قدموں پر گر پڑا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ یہ سب میرے گھر والوں کی نالائقی تھی۔ آپ نے ہمارا عیب چھپایا، خدا آپ کے عیبوں کو آخرت میں چھپائے۔''

ابا جان نے غفورا کو اٹھایا۔ پھر فرمایا۔ ''جانے بھی دو بھائی! تم ہمارے پڑوسی ہو، تمہارے بچوں نے خود توڑ لیا تو کیا ہوا۔ میں نے معاف کیا۔ خدا تم کو معاف کرے۔''

ابا جان نے یہ کہا تو ظہورن (غفورا کی بیوی جو دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھی) سامنے آ گئی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔ ''میاں! یہ ساری

خطا میری ہے۔میں نے ہی بچوں سے کہا تھا کہ بھٹے توڑ لاؤ۔'' ابا جان نے کہا۔ '' اچھا جاؤ، گھر بیٹھو جا کر۔سب کو معاف کر دیا اور دیکھو،تم کو جو ضرورت ہو، ہم سے کہہ دیا کرو۔خدا نے چاہا تو ہم تمہاری مدد کیا کریں گے۔''

سمجھا سمجھا کر ابا جان نے ان کو واپس کر دیا۔ہم سب کو بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ غفورا نماز پڑھنے لگا اور وہ بھی مسجد میں جماعت میں شریک ہونے لگا۔اور پھر سچ مچ ہمارے گھر کی اس ذرا سی نیکی سے اس کے گھر کی بُرائیاں دور ہونے لگیں۔اب غفورا ہمارا سب سے اچھا پڑوسی ہے۔

☆☆☆

ریت کی دیوار

کس سوچ میں کھڑے ہو منجھلے بھیّا! اسٹیشن سے آ رہے ہو شاید۔ السلام علیکم! اب کی بہت دنوں میں آئے!

واقعی میں سوچ میں کھڑا تھا۔ اسٹیشن ہی سے آیا تھا اور بہت دنوں کے بعد وطن گیا تھا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ بتایا کہ اس جگہ کوئی چیز تھی جسے میں نے پچھلی بار آنے پر دیکھا تھا۔ اب یاد نہیں آتی۔

''منجھلے بھیّا! ادھر دیکھو، وہ بھٹ کٹیّاں۔ اس جگہ محل......''

''اوہ ظہور! تم نے خوب یاد دلایا۔ تو وہ کیا ہوا؟'' ظہور نے بڑی حسرت کے ساتھ بتایا کہ وہ تو پارسال کھُد گیا۔''

''اتنی جلد! ابھی بنے کتنے دن ہوئے تھے۔''

''ہاں منجھلے بھیّا! جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی تو نہیں ہوئے تھے۔ بھیّا تم تیسرے برس آئے ہو۔ پہلے تم آئے تھے تو یہ محل بن کر تیار ہوا تھا۔ پھر دو سال پورے بھی نہ ہوئے تھے اور اس کی نیویں بھی کھُد گئیں۔ دیکھو منجھلے بھیّا! اب اس جگہ جہاں انسان بستے تھے۔ وہاں بھٹ کٹیاں براج رہی ہیں۔ منجھلے

بھیّا! آؤ چائے تو پی لو۔''

''نہیں ظہور! اب مجھے جانے دو۔ کیا زمانے کے انقلاب ہیں۔''

''ہاں منجھلے بھیّا! انسان سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں۔ اس کی امیدیں بھی تو کچھ نہیں۔ سب پانی کا بلبلہ۔ پانی کا بلبلہ بتاشے کی طرح ذرا پانی پڑا کہ بیٹھ گیا۔ اس خاندان پر اوس پڑ گئی اوس۔ چلو منجھلے بھیّا! میں چائے پلائے بغیر نہ جانے دوں گا۔''

ظہور نے میرا تھیلا پکڑ لیا اور اپنے گھر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اس کا مکان وہاں سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر ہی ہے۔ اس کی بیوی نے میاں کی آواز سنی تو گھر کی نیچی دیواروں کے پاس کھڑی ہو کر دیکھا اور پکاری۔

''مُنّے کے ابّا! منجھلے بھیّا کو جانے نہ دینا۔ بڑی اچھی سوندھی کلیجی تیار ہے۔ منجھلے بھیّا کو کھلائے بنا نہ جانے دینا۔''

''ارے بھئی!''

''منجھلے بھیّا! ارے بھئی ورے بھئی کچھ نہیں۔ اب تو تم قید ہو گئے۔ تم چھوٹے کہ گھر والی میرے لتّے لے ڈالے گی۔''

ظہور مجھے کھینچتا اپنے گھر میں لے گیا۔ ایک چار پائی پر دری بچھا دی۔ مجھے بٹھایا اور پھر لگے گھر بھر خاطر میں۔ وہ چائے کی پتّی لینے دوڑا۔ اس کی بیوی نے

چولھے پر پانی رکھا۔ برکتیا لوٹے میں گرم پانی لائی۔ اور منّے میاں سب سے الگ تھلگ دیوار میں نہ جانے کیا کرید رہے تھے۔ وہ ''چھامل چھامل'' کہتے دوڑے میں اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ برکتیا سے پوچھا ''منّے کیا کہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کہتا ہے سلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے خوب آواز بڑھا کر جواب دیا۔ منّے کو پاس بٹھا لیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ظہور آ گیا۔ چائے بنی۔ ایک رکابی میں کلیجی آئی۔ ایک موٹی سی بیسنی روٹی پر ذرا ذرا گھی لگا تھا۔ خوب مزہ لے کر کھائی۔ پھر چائے پی۔

''منّے کے ابّا! منجھلے بھیّا کاہے کو رُک گئے تھے پُلیا پر۔''

''تم جانتی ہو منّے کی ماں! منجھلے بھیّا کی یاد بڑی تیز ہے۔''

''وہ تو ہئی ہے۔ چار آنکھیں جو ہیں منجھلے بھیّا کے۔''

''ہاں تو تیسرے سال جو آئے تھے نا! پارک میں جلسہ ہوا تھا اسی سال تو یہ محل بنا تھا۔''

''ہاں تو اور کیا۔ ابھی کے دن ہوئے۔ ہائے اللہ اور کھد بھی گیا تو پھر کیا، ''جیسے بھوت ویسے کرتوت۔''

''تو منجھلے بھیّا! اب جو تیسرے برس آئے تو محل یہاں پر تھا نہیں۔ پر دیکھ

تو ان کی یاد۔ اس جگہ آتے ہی ٹھٹک گئے اور سوچنے لگے۔ کچھ تھا یہاں پر؟ میں نے بتایا کہ محل تھا کھد گیا۔ بے چارے افسوس کرنے لگے۔''

''ہٹو جی! افسوس کا ہے کا۔ جیسا جس کا دھرم ویسے اس کے کرم۔ دیدے پھوٹی کو دکھتا نہ تھا۔ کل کیا ہوگا۔ ادھر میاں کی آنکھ مندی ادھر دے سنیما، دے نوٹنکی، میراثنیں بھی نچوائی جانے لگیں۔ اُونھ میرے منھ میں خاک، گڑیا گڈے کے بیاہ رچنے لگے۔ باجے بجے، رت جگا برات سرات سب کچھ ہوا۔

''منجھلے بھیّا! کلیجی تو وہ ویسی کی ویسی رکھی ہے۔ کھاؤ نا!''

''کھا رہا ہوں۔ ہاں پھر کیا ہوا۔ منّے کی ماں میری دلچسپی بڑھنے لگی۔''

''ہوا کیا۔ منجھلے بھیّا! وہ جو کہا ہے نا! کہ حرام کی کمائی خوب اڑائی۔ بس وہ حرام کمائی ہی تو تھی، جس سے یہ محل کھڑا کیا گیا۔ یہ بڑا نوٹ اڑایا اور رات تک ختم۔ ہاں وہ جھلّی دار نوٹ۔ توبہ ایسا بھی کوئی ہوگا۔ منجھلے بھیّا اور پیؤ بس دو ہی پیالی۔ شہر میں جاکر کم کھانے لگے ہو۔''

کھایا تو خوب اور پیا بھی خوب، تم نے جو قصہ چھیڑا ہے۔ اُسے تمام کرو۔

''تمام تو کر دیا۔ ریت کی دیوار بھی کہیں رُکی ہے۔ سال بھر میں سب دھرا دھرایا ختم ہو گیا۔ دو بیٹیاں تھیں۔ بی صاحبہ نے اُن کے بیاہ رچائے، چاندی کے پتر چڑھے، مسہری کے پائے، چاندی کا پاندان اور چاندی کا سنگار، بکس تک

دیا۔ سب لٹا دیا۔ لڑکے کا بیاہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا اور لڑکے کا بیاہ کیا ہوگا وہ تو بے چارہ اب مل میں نوکر ہے۔ تین میل پیدل جاتا ہے روز۔ یہ سب ہو گیا تو سنا کہ بی جمالو ہزاروں کی قرض دار ہو گئیں ہیں۔ پھر کیا تھا۔ اسی قرض میں یہ محل گیا۔ مہاجن نے سب کھدوا کر برابر کر دیا اسے درد کا ہے کا؟''

''اور اب کہاں ہیں وہ بیگم صاحبہ؟''

''منجھلے بھیّا! سنا ہے کہ وہ لکھنؤ چلی گئیں۔''

''اور لڑکا یہاں۔''

''ہاں منجھلے بھیّا! ایک دن لڑکا گلا گھونٹے دیئے رہا تھا۔ لوگوں نے چھڑایا۔ بس تب ہی سے یہ یہاں اور وہ وہاں۔ سب تین تیرہ کر دیا۔ اللہ بچائے توبہ ہے میری! دیکھئے منجھلے بھیّا! میں کسی کی غیبت نہیں کرتی۔''

منّے کی ماں سے یہ سن کر دنیا کی بے ثباتی کی تصویر میری نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ پھر جب میں وطن سے یہاں واپس آیا تو ابھی نہیں گیا ہوں۔ مگر رہ رہ کر وہ محل یاد آتا ہے۔ اور یاد آتا رہے گا۔ کیوں کہ کوئی محل اتنی جلد کھدتے میں نے نہیں دیکھا۔ انقلابات ہیں زمانے کے اور یہ سب ہیں کرتوت ہم انسانوں کے۔

☆☆☆

آخری وقت میں

یہ واقعہ مجھے اس وقت سے یاد ہے جب میں ایک بے شعور بچہ ہی تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً بارہ سال کی تھی۔ میرا بچپن جس معاشرے میں گذرا اس میں زیادہ تر لوگ جاہل تھے۔ ان جاہلوں میں ایک شخص تھا۔ عجیب معجون مرکب قسم کا آدمی۔ رمضان کا مہینہ آتا تو روزے رکھتا اور اپنے کو روزہ دار جتانے کے لئے لوگوں سے خوب لڑتا رہتا۔ محرم کا زمانہ آتا اور علم و تعزیوں کی دھوم مچتی تو مرثیہ خوانوں کی ٹولی میں جا شامل ہوتا۔ پڑھا لکھا تو تھا نہیں۔ مگر سب کے ساتھ منھ کھول کر یوں سر ملاتا جیسے اسے مرثیہ خوب یاد ہے۔ اس کے بعد دیوالی آتی تو جوا کھیلتا کھلاتا۔ ساون کے مہینے میں اکھاڑے میں جا کودتا اور ڈنڈ پیلتا اور کشتی لڑتا نظر آتا اور ہولی آتی تو ہولیکاؤں کے ساتھ ہولی کے گیت گنگناتا رہتا۔ گنگناتے گنگناتے زور زور سے گانے لگتا۔

مجھے اس کے گیتوں کا وہ مصرع اب تک یاد ہے جو درحقیقت اسے یاد رکھنے کا باعث بنا۔ مصرعہ ہے:

''چل چل رے بھونرا بگیا کو''

وہ یہ مصرعہ اتنا زیادہ رٹا کرتا کہ ہم بچوں کی زبان پر اکثر یہی آتا رہتا۔ میں جب یہ مصرعہ غیر شعوری طور پر رٹتا ہوا گھر آتا تو اپنے بزرگوں سے پٹتے پٹتے بچتا۔

اب سنئے وہ عبرت ناک واقعہ جو درحقیقت میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ہمارا یہ ہولیکار بیمار پڑا۔ اس کی بیماری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ موت کا وقت قریب آ گیا۔ نزع کے وقت لوگوں کو خیال آیا کہ ہم سب مسلمان ہیں اور یہ مرنے والا بھی مسلمان ہے۔ اس نے کاہے کو کبھی کلمہ پڑھا ہوگا۔ اب مرتے وقت اس سے کلمہ پڑھوالیا جائے۔ چنانچہ اس سے کلمہ پڑھنے کو کہا گیا۔ اس نے آخری وقت میں وہی منہ سے نکالا:

''چل چل رے بھونرا بگیا کو''

اور اس کی سانس اُکھڑ گئی۔

کتنی سچی ہے اس حکیم کی رائے جس نے کہا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر جو فکر چھائی رہتی ہے۔ مرتے وقت اسی کا صدور ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اسمائے الٰہی کا ذکر کرتے ہیں۔

☆☆☆

بولتی مینا

ہاجرہ باجی کی شادی تھی۔ شادی میں ہمارے سبھی رشتے دار آئے تھے۔ خالہ، خالو، ماموں، ممانی، پھوپھی، پھوپھا، پھوپھی اور ایسے ہی دور اور نزدیک کے سارے رشتے دار موجود تھے۔ ان سب کے ساتھ بچے بھی تھے۔ میرا ماموں زاد بھائی سعید بھی آیا تھا۔ سعید اپنے ساتھ ایک پنجرے میں ایک مینا بھی لایا تھا۔

سعید اس سے پہلے کئی بار میرے گھر آ چکا تھا اور میں اس کے یہاں جا چکا تھا۔ ہم دونوں مہینوں ایک ساتھ رہے تھے۔ ایک ساتھ رہنے سے میں سعید کی ساری حرکتوں کو جانتا تھا۔ وہ بڑا ہی خراب لڑکا تھا۔ نہ تو نماز پڑھتا نہ روزے رکھتا، نہ اپنی امّی کا کہنا مانتا، نہ اپنے ابّا کے حکم کی پروا کرتا اور نہ ٹھیک سے پڑھتا لکھتا ہی تھا۔ بس رات دن دُھن تھی تو کھیل کود کی۔ کھیلوں میں وہ اودھم مچاتا کہ توبہ بھلی۔ کھیلوں میں وہ دوسرے بچوں سے لڑتا بھی، گالیاں بھی بکتا اور جھوٹ تو بات بات میں بولتا۔ چوری کرنے سے بھی نہ چوکتا۔ جہاں موقع مل جاتا

دوسروں کی چیزیں اڑا لے جاتا۔ اس کی انہی بری باتوں سے اس کے گھر والے پریشان رہتے اور سوچا کرتے کہ کیسے وہ اچھا بن سکے گا۔

ہاجرہ باجی کی شادی میں آیا تو پہلے دو تین دن میں اس سے ڈرتا رہا۔ لیکن اب وہ بالکل بدل گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ صبح سویرے سو کر اٹھتا۔ نمازیں پڑھتا۔ ماں باپ کا کہنا مانتا۔ بچوں سے لڑنے بھڑنے کے بدلے اب وہ مل جل کر رہتا۔ اب اس میں بُری حرکتیں نہ تھیں۔ وہ بڑا نیک بن گیا تھا۔ اس میں اچھی باتیں دیکھیں تو میرا ڈر جاتا رہا۔ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سعید اپنی مینا کو بہت پیار کرتا ہے۔ ہر وقت اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اور جہاں جاتا ہے ساتھ لے جاتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”سعید میاں! ایک بات بتاؤ، تمہاری بُری باتیں کیسے چھوٹیں اور تم اس مینا سے اتنی محبت کیوں کرتے ہو؟“ میرے یہ پوچھنے پر سعید نے بتایا کہ یہی مینا تو ہے جس نے میری بُری باتیں چھڑا دیں۔“ میں نے پوچھا ”وہ کیسے؟“ سعید بولا:

”بھئی بات یہ ہے کہ ایک دن میرے ابّا کہیں سے یہ بولتی مینا لے آئے۔ میں نے جیسے ہی مینا کو دیکھا۔ جھٹ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور ابّا سے ضد کرنے

لگا کہ مینا مجھے دے دیں۔ ابّا جان نے پنجرہ مجھے دے دیا۔ پنجرہ لے کر میں گھر بھر میں دھوم مچاتا پھرا۔ کبھی اسے لے کر دوڑتا، کبھی گاتا اور میرا گانا تم جانتے ہی ہو، گندے گانے گاتا جو لونڈے گلیوں میں گایا کرتے ہیں۔

مینا ابھی تک چپ تھی۔ شاید وہ ڈر رہی تھی۔ لیکن جب میں نے ایک بڑا ہی بُرا گانا شروع کیا تو وہ چہکی اور اس نے بھی گانا شروع کر دیا۔ میں نے سنا وہ گا رہی تھی: ؎

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

مجھے مینا کا گانا بڑا اچھا لگا۔ میں چپ ہو کر سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئی تو میں نے کہا۔ ’’مینا بی! پھر گاؤ۔‘‘ وہ پھر چہکنے لگی: ؎

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

’’کام اچھے کرو‘‘ کا تو مطلب میں سمجھ گیا لیکن ’’اپنے رب سے ڈرو‘‘ کا مطلب میں نہ سمجھا۔ خیر مطلب سے کیا مطلب ہے بھائی!

گانا تو مزے دار رہا...... اور سب سے زیادہ مزے کی بات یہ کہ جہاں میں نے کوئی بات کی کہ مینا زور سے چہکی: ؎

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

میں کسی سے لڑا تو وہی بول رٹنے لگی۔ ''اپنے رب سے ڈرو۔'' میں نے گالی بکی تو اس کی زبان سے نکلنے لگا۔ ''اپنے رب سے ڈرو۔'' میں نے ماں باپ کا کہنا ٹالا کہ وہ بول پڑی۔ ''اپنے رب سے ڈرو۔'' مطلب یہ کہ ہر وقت وہ یہی رٹتی رہی کہ ''اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو۔'' اس کے رٹنے سے اس کا یہ گانا مجھے بھی یاد ہو گیا اور سچی بات یہ ہے کہ جب میں باہر سے گھر میں آیا۔ مینا کو دیکھا تو ایک طرف سے میں نے گانا شروع کر دیا۔

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

اور پھر یہ ہوا کہ مینا کی طرح یہی میں بھی رٹنے لگا۔

ایک دن ابا جان نے مجھ سے پوچھا۔ میاں سعید! یہ جو تم گاتے ہو، اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟ ابا جان کے پوچھنے پر میں نے ہنس دیا۔ پھر کہا کہ ''کام اچھے کرو'' کا مطلب تو میں سمجھتا ہوں لیکن ''اپنے رب سے ڈرو'' کے معنیٰ میں نہیں جانتا۔

ابا جان نے کہا'' کام اچھے کرو'' کا کیا مطلب ہے؟ میں نے جواب دیا۔ یہی کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، ماں باپ کا کہنا مانو، سچ بولو، میل جول سے رہو، بڑوں کا ادب کرو۔ اسی طرح کے سارے کام اچھے کام ہوتے ہیں۔

میں نے جو یہ کہا تو ابا جان بولے۔ ’’تو میاں! تم یہ اچھے کام کرتے بھی ہو کہ بس رٹ ہی لگا رکھی ہے۔‘‘

ابا جان نے یہ سوال کیا تو میں شرما گیا اور چپ ہو گیا۔ اس کے بعد ابا جان نے رب سے ڈرنے کا مطلب بتایا۔

ابا جان نے بتایا کہ دیکھو بھئی! اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے۔ رب کا مطلب ہے ہمارا پالنے والا ہے۔ ہماری دیکھ بھال کرنے والا، ہمیں سب کچھ دینے والا، ہمارا مالک، ہمارا مولا، ہمارا حاکم، ہمارا آقا، کیسا مہربان ہے۔ ہمارا مالک اور ہمارا اللہ۔ اس نے ہمارے لئے اوپر سے پانی برسایا۔ ہمارے لئے روزی کا سامان کر دیا۔ ہمیں آدمی بنایا۔ اگر ہمیں جانور بنا دیتا تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ ہمارے لئے یہ پھل پھول، یہ کھیت، یہ میوے اور یہ جانور وغیرہ پیدا کئے۔ ایسے مہربان مالک کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس کا کہنا ماننا ضروری ہے۔ اس کے حکموں پر چلنا ضروری ہے۔ اگر کہیں وہ ناراض ہو جائے اور یہ سب نعمتیں چھین لے تو پھر کون یہ سب ہمیں دے سکتا ہے؟ اور بات یہی نہیں۔ ایک اور بات ہے یاد رکھو! ایک دن اللہ تعالیٰ ہم سب سے پوچھے گا کہ میں نے تم کو ساری نعمتیں دیں تو تم نے میرا

شکر یہ ادا کیا یا من مانی کرتے رہے۔ میرا کہا مانا یا شیطان کا؟ سوچو! اس وقت کیا جواب ہوگا جانتے ہو۔ اگر اس دن ٹھیک جواب نہ دے سکے۔ تو اللہ تعالیٰ جہنم میں جھونک دے گا۔''

ابا جان یہیں تک کہہ سکے تھے کہ میں نے ایک جھرجھری لی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے ڈر لگنے لگا اور سچ مچ میری سمجھ میں آ گیا کہ ''اپنے رب سے ڈرو'' کا مطلب کیا ہے؟

بس وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ میں نے ایک ایک کر کے ساری بُری باتیں چھوڑ دیں۔ اور اچھی باتیں کرنے لگا۔ صبح سویرے اٹھنے لگا۔ نماز پڑھنے لگا۔ بُرے لڑکوں سے دور رہنے لگا۔ اب مولوی صاحب جو سبق دیتے، یاد کر لیتا۔ جو اچھی بات کتاب میں پڑھتا، اسے دھیان میں رکھتا۔ اور جب موقع ملتا، کرتا بھی۔ اس طرح اب میں وہ سعید نہیں رہا جو تم نے پچھلے سال دیکھا تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایک چڑیا کے دو بولوں نے مجھے اچھائیوں کا دھیان دلایا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس مینا کو بہت پیار کرتا ہوں۔

سعید میاں نے اپنا یہ حال بتایا تو میں نے بھی پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی مینا چہکی۔

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

اور پھر سعید میاں اور اس کے بعد میں نے بھی یہی بول دہرائے۔

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کام کرو

ہم دونوں نے پہلے تو دھیرے دھیرے پھر ذرا اور زور سے ''اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو۔'' رٹنا شروع کر دیئے۔ ہم دونوں کے ساتھ مینا بھی۔ ''اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو'' شور کرنے لگی۔

ہماری یہ آوازیں بلند ہوئیں تو جو عورتیں ہاجرہ باجی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں وہ سب ہماری طرف دیکھنے لگیں اور پھر کسی نے ہنس کر کہا۔ ''لو بھئی شادی میں ناچ تو حرام ہے۔ لیکن یہ گانا خوب ہے...... ''مبارک ہو یہ شادی۔''

اب ہم نے دیکھا۔ اس دن بارات میں جو بچے آئے تھے ان میں سے بہتوں کی زبان پر یہی تھا۔

اپنے رب سے ڈرو کام اچھے کرو

☆☆☆

لٹّھا پیر بابا

آج چچا میاں گھر آئے تو مسکراتے ہوئے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ ہم سب سمجھ گئے۔ آج اخبار میں کوئی بڑے مزے دار خبر چھپی ہے۔ بس ہم نے چچا میاں سے کہنا شروع کر دیا۔ ''چچا میاں! اخبار ہمیں بھی سنایئے۔''

''ہش، بھاگو یہاں سے۔'' کہتے ہوئے چچا میاں بولے۔ ''پڑھے نہ لکھے نام ملا فاضل، تم اور اخبار، یہ منہ اور مسور کی دال۔ جاؤ کھیلو جا کر۔'' اور یہ کہہ کر ہنسے بھی۔ ان کے ہنسنے پر ہمیں پورا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو، ہے ضرور مزے دار خبر۔ بھلا اب ہم کاہے کو بھاگتے۔ سمجھ گئے چچا میاں خوشامد کرائے بغیر نہیں سنائیں گے۔ بس ایک طرف سے میاں پمّی بولے۔ ''چچا میاں! حقہ پھر لاؤں؟ اور پمّی صاحب حقّے کی طرف بڑھے۔ دوسری طرف سے صفّو باجی بولیں۔

'چچا میاں پان لاؤں؟'' اور وہ پان لینے بھاگیں۔ اسی طرح کوئی چچا میاں کے لئے پانی لینے بھاگا۔ کوئی بستر ٹھیک کرنے لگا۔ میں نے لپک کے

کرسی اٹھائی اور چچا میاں کے لئے ڈال دی۔ چچا میاں کرسی پر بیٹھے تو میں ان کے جوتوں کے فیتے کھولنے لگی۔ خوش ہو کر بولے۔ ''لٹّھا پیر بابا کی مزے دار خبر چھپی ہے۔''

''میں نے جو لٹّھا پیر بابا کا نام سنا تو پہلے کچھ تعجب ہوا پھر زور سے چلائی۔ ارے چلو جلدی صفّو باجی دوڑ کے آؤ، صدو میاں، پمّی صاحب اور فلاں فلاں! سنو آ کر لٹّھا پیر بابا کا حال۔''

''لٹّھا پیر بابا'' یہ نام کاہے کو کسی نے سنا ہو گا۔ سب دوڑے دوڑے آئے۔ حقہ، پان اور پانی وغیرہ سب سامنے رکھ دیا گیا۔ چچا میاں کرسی سے اُٹھے۔ ایک پان منہ میں رکھا اور پلنگ پر جا لیٹے۔ اخبار اٹھایا، مسکرائے اور کہنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ! کیسے مکّار لوگ دنیا میں بستے ہیں۔''

صفّو باجی کو اتنی تاب کہاں؟ بولیں سنائیے۔ بس جلدی لٹّھا پیر بابا کا حال سنائیے۔''

چچا میاں نے اگال دان میں پیک تھوکی۔ بولے۔ ''ارے بھئی، راول پنڈی جانتے ہو نا۔ جہاں تمہارے ماموں اشرف خاں رہتے ہیں۔'' ہم سب نے جواب دیا۔ ''ہاں ہاں راولپنڈی پاکستان میں جو ہے۔'' ''بس بس وہی۔'' چچا میاں نے کہا۔ ''اب تو بھئی راول پنڈی کے بڑے مرتبے ہیں پاکستان

سرکار نے تو راول پنڈی کو اپنی راجدھانی بنایا ہے۔ اب تو خوب ترقی کرے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ویسے کیا کم تھا راول پنڈی۔"

چچا میاں میں ایک عادت ہے۔ ذرا سی بات کو اتنا لمبا کر کے کہتے ہیں کہ ہم اُکتا جاتے ہیں۔ کہاں لٹّھا پیر بابا کا قصہ سنانے چلے تھے۔ اب جو راول پنڈی کا نام آ گیا تو بس راول پنڈی کی بال کی کھال نکالنا شروع کر دی۔ صفّو باجی نے منھ بنا کر کہا۔ "لٹّھا پیر بابا کا حال نہیں سناتے۔"

چچا میاں میں یہ بات ضرور ہے کہ ہم سب کا چہرہ دیکھ کر اور ہماری باتیں سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ ان بچوں کا جی کیا چاہتا ہے؟ بس جو تم سب نے منھ بنا لیا تو بولے:

"ارے بھائی! راول پنڈی ہی کی تو بات ہے۔ وہاں لیہہ پُل ہے۔ اس پُل کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔"

ادھیڑ عمر کا آدمی کیسا ہوتا ہے، چچا میاں! پمّی صاحب نے سنتے سنتے پوچھا۔ چچا میاں نے بتایا۔ "ادھیڑ عمر کا آدمی وہ ہوتا ہے جو جوانی اور بڑھاپے کے بیچ میں ہو یعنی چالیس سال سے اوپر اور پچاس سال سے نیچے۔" "جیسے ابو جان!" میں نے مثال دی۔ چچا میاں نے کہا، ہاں بھئی! بالکل ٹھیک، اچھا تو وہ ادھیڑ عمر کا آدمی بڑا سیانا، بڑا چالاک اور بڑا ہی مکّار تھا۔ ایک بار اس نے ایک پیر صاحب کو دیکھا کہ لوگ ان کے ہاتھ، پیر چوم رہے ہیں۔ ان کو خوب روپیہ پیسہ دے

رہے تھے۔ بس اس آدمی کے دل میں بیٹھ گئی کہ ''پیر جی'' بننا چاہئے۔ اب پیر جی بننا چاہئے۔ اب وہ پیر بننے کی تدبیر سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آ گئی۔ رات ہی میں جھونپڑی کے قریب ایک پانچ فیٹ کا موٹا سا لٹّھا دفن کر کے قبر سی بنا دی۔ صبح کو لوگوں سے کہا۔ ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ بڑے پیر صاحب آئے۔ انھوں نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔ ''اٹھ'' میں اُٹھ بیٹھا۔ اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑے پیر صاحب نے فرمایا۔ ''اس جگہ ہمارے ایک بیٹے کی قبر ہے۔ اس پر مزار بناؤ اور عرس کرو۔'' یہ کہہ کر بڑے پیر صاحب غائب ہو گئے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اسی وقت قبر بنائی۔ اب تو میں دن رات اسی قبر کی مجاوری کروں گا۔''

''کیا کروں گا چچا میاں ...... مجاوری؟'' صدو نے پوچھا۔

''ہاں بھئی مجاوری۔'' چچا میاں نے مجاوری کے معنیٰ یہ بتائے کہ اس قبر پر جھاڑو دینا، اُسے ٹھیک ٹھاک رکھنا اور اس پر دیئے اور چراغ جلانا وغیرہ۔ اچھا بھئی جاہل اور بے پڑھے لکھے لوگوں نے جو یہ سنا تو سب قبر کو چومنے چاٹنے لگے اور مرادیں مانگنے لگے۔ بہت سارا چندہ جمع کر کے اس ادھیڑ آدمی کو دیا۔ اب اس نے اپنا نام کرامت شاہ رکھا اور چندہ کر کے عرس کی تیاری کرنے لگا۔

بڑی دھوم دھام سے عرس ہوا۔ قوالی ہوئی۔ ایک دن مفت کھانا بٹوایا۔

لوگوں نے خوب خوب چڑھاوے چڑھائے۔ عرس کے بعد کرامت شاہ کو بڑا نفع ہوا۔ اُس نے اِدھر اُدھر ڈھنڈورا پٹوادیا کہ بڑے پیر صاحب کے بیٹے کی قبر ظاہر ہوئی ہے۔ ان کا مزار بننا ہے چندہ دو۔

جاہل لوگوں نے خوب چندہ دیا۔ ہزاروں روپیہ جمع ہو گیا۔ مزار بن گیا اور کرامت شاہ پیر بن کر بیٹھا۔ بہت دنوں تک پیری کے ٹھاٹ خوب جمائے۔

اب سنئے۔ اس سال ۳/اپریل ۱۹۶۰ء کو پاکستان سرکار نے طے کیا کہ لیہہ پُل چوڑا کیا جائے۔ اس جگہ کی نپائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب تک مزار کھودا نہ جائے گا۔ لیہہ پُل چوڑا نہ ہو سکے گا۔ یہ بات لوگوں نے سنی تو وہ دوڑے اور بولے کہ مزار کیسے کھد سکتا ہے۔ یہ بڑے پیر صاحب کے بیٹے کا ہے۔ مگر بھئی واہ! پاکستان کے لوگ بھی بڑے سیانے نکلے۔ انھوں نے کرامت شاہ کو پٹّی پڑھائی۔ کیا پڑھائی پٹّی؟ پمّی صاحب بولے۔ ''کیا پٹّی کسی کتاب کا نام ہے؟'' چچا میاں نے کہا۔ ''ارے بھئی پٹّی پڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے کچھ دے دلا کر منالیا۔ دو چار ہزار روپئے دے دیئے ہوں گے۔

کرامت شاہ مان گئے اور روپئے لے کر کہیں چلتے بنے۔ اب جو مزار کھودا گیا تو اس میں سے نکلا پانچ فیٹ کا موٹا سالٹّھا۔ ہزاروں آدمی کھدائی کے وقت موجود تھے۔ ان سب نے بڑے پیر صاحب کے بیٹے کی لاش کے بدلے لٹّھا

جو دیکھا تو دنگ رہ گئے اور کرامت شاہ کی مکّاری سمجھ گئے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا تو کرامت شاہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پتہ کیا ہوتا روپیہ لے کر نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

بس اسی دن سے یہ خبر لٹھا پیر بابا کے نام سے اخباروں میں چھپی۔ آج کے اخبار میں میں نے پڑھی اور تم سب کو سنا دی۔ ہے نہ مزے دار اور نصیحت والی بھی۔ اور تم سب کبھی کسی کے بہکانے میں مت آنا۔"

چچا میاں نے خبر سنائی تو ہم سب ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ تعجب کے مارے ہمارے منھ سے کوئی بول نہ نکلا۔ چچا میاں کے پاس سے چپکے سے اُٹھے اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

☆☆☆

میں نے دیکھا

کیا دیکھا؟ کہاں سے دیکھا؟ دیکھا تو میں نے اپنی کھڑکی سے جو سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ اور دیکھا کیا؟ یہ بتاتی ہوں۔ پہلے میں یہ بتا دوں کہ میری ایک باجی ہیں۔ وہ رسالے پڑھتی ہیں مگر چپکے ہی چپکے یعنی دل ہی دل میں۔ یعنی نظر ہی نظر سے پڑھتی ہیں۔ یعنی آواز سے نہیں پڑھتیں۔ تو میں کہتی ہوں "باجی!

مجھے بھی کوئی مزے دار کہانی سناؤ نا!'' وہ انگوٹھا دکھاتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ ''پپّو! تو سمجھے گی کیا؟'' میں چپ ہو جاتی ہوں۔ لیکن کچھ دنوں سے میں باجی کی محتاج نہیں ہوں۔ آپ سمجھے! کب سے؟ بھئی، جب سے میں اس کھڑکی میں آ کر بیٹھنے لگی اور سڑک پر بوڑھے، جوان اور بچوں کو آتے جاتے دیکھا۔ تو بتاؤں کیا دیکھا؟ یا کیا دیکھتی ہوں؟ میں اب چلتی پھرتی کہانیاں دیکھتی ہوں۔ چلتی پھرتی کہانیاں سمجھے آپ؟ یعنی میں تو ان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتی ہوں۔ وہ سڑک پر میری کھڑکی کے سامنے کوئی کہانی دکھا دیتے ہیں۔ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پڑھے لکھے لوگ انہی جیسے لڑکوں کو دیکھ کر کہانیاں بنا لیتے اور لکھ لیتے ہیں۔ پھر وہی باجی پڑھ لیتی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اگر کوئی پڑھنا نہ جانتا ہو تو وہ باجی کی خوشامد ہرگز نہ کرے، وہ آ کر میرے پاس بیٹھے۔ کہاں بیٹھے؟ اسی کھڑکی میں جو سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ میں اُسے ایسی ایسی کہانیاں ہوتے دکھاؤں کہ مزہ آ جائے۔ بالکل سچی کہانیاں تو سنئے، میں نے آج کیا دیکھا اپنی کھڑکی سے۔ میں نے دیکھا کہ:

جلال اپنے مکان کے چبوترے پر بیٹھا ہے اور کنکر پتھر اکٹّھا کر کے ان کی ڈھیریاں لگا رہا ہے۔ آپ سمجھیں! کون جلال؟ ارے بھئی وہ کمال خاں گڈھی والے کا لڑکا ہے۔ بڑے آدمی کا لڑکا۔ یعنی امیر۔ امیر کا یعنی مالدار۔ تو جلال کو

اس کا گھمنڈ بھی ہے۔ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ اس نے کنکر پتھر کی ڈھیریاں لگا کر یہ کیا کہ پہلے تو کچھ دیر انھیں دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔ پھر ایک آدمی جا رہا تھا۔ اس کے ایک کنکری پھینک کر ماری۔ آدمی تھا غریب۔ کنکری اس کے سر میں لگی۔ وہ اُف کر کے رہ گیا۔ دیکھا تو جلال مسکرا رہا تھا۔ وہ آدمی جلال کے پاس گیا۔ جلال ڈرا نہیں، نہ بھاگا، امیر آدمی کا لڑکا جو تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کوئی کیا کر لے گا۔

اچھا تو وہ کھڑا رہا۔ غریب آدمی پاس گیا۔ پہلے تو اُس نے جلال کو سمجھایا۔ مگر جلال کب سنتا۔ وہ تو گھمنڈی تھا نا! اچھا تو جلال ہنستا رہا۔ تو اس غریب آدمی نے یہ کیا کہ پانچ پیسے کا سکّہ جیب سے نکالا اور اسے دے دیا اور کہا۔ ''تم نے چھوٹی کنکری ماری۔ اس لئے بس یہی ہو۔''

میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ خوب رہی کنکری ماری اور انعام بھی ملا۔ آگے سنئے ہوا کیا؟

خاں صاحب سے جلال پانچ پیسے پا کر خوب ہنسا۔ دل میں سوچا۔ ''اب کوئی کھاتا پیتا آدمی نکلے۔ یعنی ایسا آدمی جس کے پاس چار پیسے ہوں۔ چار پیسے کا مطلب چار ہی پیسے نہیں۔ یعنی وہ بھی کچھ مالدار ہو۔ اُس کے بڑا سا پتھر جماؤں تو کم سے کم روپیہ ملے گا۔

اچھا جی! تو کچھ دیر بعد نکلے حسینی پہلوان۔ جلال نے انھیں تاکا۔ بڑا سا پتھر پھینک مارا۔ حسینی پہلوان نے پلٹ کر جلال کو پکڑا اور بولے۔ ''کیوں بے ادب! تو نے پتھر کیوں مارا؟'' اس کے جواب میں جلال خاں خوب ہنسا۔ پھر بولا۔ ''پہلوان صاحب! پہلے ایک روپیہ نکالئے بڑا سا پتھر مارا ہے میں نے۔''

حسینی پہلوان اب خفا ہو گئے۔ سمجھ گئے کہ بڑا ڈھیٹ لڑکا ہے۔ انھوں نے پکڑ کر جلال خاں کو چبوترے پر سے کھینچ لیا۔

''اری پپّو! کب تک کھڑکی میں بیٹھی رہے گی۔ چل تو ذرا وہ گلاس تو اٹھا دے۔''

آپ سمجھے! یہ کس کی آواز تھی؟ یہ امّی جان کی آواز تھی۔ ٹھیک اُس وقت آئی جب کہانی مزے پر آئی تھی۔ کیا بتاؤں؟ امّی جان کا کہنا کرنا پڑا۔ میں کھڑکی سے اُتر آئی اور گلاس اٹھا کر امّی کو دیا۔ تو انھوں نے اور بہت سے کاموں میں لگا لیا۔ پھر کیا ہوا ہوگا جلال کا؟ خیر یہ میں سمجھ تو گئی۔ آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی۔ مگر کیا بتاؤں دیکھتے تو اور ہی مزہ آتا۔ ہے نا!

☆☆☆